عبداللہ حسین ...... تیسرے راستے کی تلاش

(''اُداس نسلیں'' کے بعد کے فکشن کے تناظر میں)

سفیر حیدر، لیکچرر، شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

Abstract

The fundamental motive behind Abdullah Hussain's fiction revolve around inquisitive search of a "Third Way". He is ambitious to discover such relation among humans other than the relations that exist between cruel and innocence or wolf and the sheep. In this article it is discovered that he is in search of neutral and unharmful way.

نادار لوگوں کے یہاں یہ حساب بھی نہیں رکھا جاتا کہ کس کی زندگی کون بسر کر جاتا ہے۔ جاگیردارانہ تسلّط کی دہلیز پر سجدہ ریز انسانوں کو اشرف المخلوقات کے کس دائرے میں رکھا جا سکتا ہے۔

یہاں ہمارا یقین اس بات پر بڑھ جاتا ہے کہ سب سے بڑی غربت' ناطاقتی اور بے بضاعتی کی غربت ہے۔''اس ملک میں سب کچھ چلتا ہے بھئی!'' کے تکیہ کلام کے سہارے ناقص اشیائے خوردنی بنانے والے بے خف وخطر انسانی جانوں سے کھیلتے ہیں کیونکہ مینجمنٹ سے معاملہ طے ہو چکا ہے۔ یہ بھی آدم خوری کی ایک صورت ہے۔ ایک حاجی صاحب جن کی فیکٹریوں کا تیار کردہ گھی کئی انسانوں کی جان لے چکا ہے ان کا ایک جملہ پاکستان کے کاروباری حلقے کی کثیر تعداد کی ظاہری شرعی ہئیت اور منافقانہ زندگی کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالی ہے میرے دل میں ایک ہی خواہش ہے کہ خداوند تعالیٰ مجھے مدینے میں موت نصیب کرے۔

کیا یہاں انسان اور قربانی کے جانور میں امتیاز ممکن ہے؟ چودھری جہانگیر کا بیٹا عالمگیر قتل کر دیتا ہے تو چودھری اپنے کمّی نورے مصلّی کو ڈیرے پر بُلاتا ہے۔

''نورے

جی سرکار

تُو نے کچھ سُنا

کان میں آواز تو پڑی ہے

اقرار اور گرفتاری دینی ہے

جو حکم سرکار''۱

تقسیم اور ہجرت کے وقت انسان کُشی یہ کون سی منزل تھی کہ کچھ لوگ اس لیے بچ گئے کہ قاتل قیلولہ کرنا چاہ رہے تھے کیونکہ تھکن سے چُور چُور تھے۔ وہ انسانوں کو مار مار کر اس قدر اُکتا چکے تھے کے نئے قافلے کے سہمے ہوئے خوفزدہ چہروں کے نظارے سے اپنی وحشی جبلّت کو مطمئن کر لیتے۔ انسان کے باؤلے پن پر جانوروں کا ردِّ عمل دکھا کر عبداللہ حسین نے انسان کی اسفل السافلین کی حیثیت بھی دکھائی ہے۔

''اس عجیب وقت میں جانوروں کے اندر ایک تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ بڑے بڑے خونخوار کُتے' منہ زور گھوڑے اور اڑیل مویشی منہ اُٹھا کے آسمان کو دیکھتے اور گردن موڑ لیتے تھے۔''۲

وحشی انسانی جبلّت کی ننگی تصویر کشی ''نادار لوگ'' کے ان صفحات میں بے مثل ہے جہاں سقوطِ ڈھاکہ کے حوالے سے تاریخ کے پریشر ککر کا ڈھکنا اُٹھانے کی کوشش کی گئی ہے جس کے اندر انسانی روحوں کی سسکیاں گل رہی ہیں۔ یہ اُن انسانوں کا نوحہ ہے جنھیں اپنی سرزمین پر ہی اجنبی بنا دیا گیا۔ یہ اپنوں کے ہاتھ اپنوں کے جسم چھلنی ہونے کی داستان ہے۔ یہاں نظریاتی انسان کے وجود پر سوالیہ نشان بھی واضح ہوتا ہے۔ یہاں صورتحال ایسی ہے جیسے انسان کا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کو کاٹ ڈالے۔ ایک ہی جسم کی ایک آنکھ نے دوسری آنکھ کو پھوڑ ڈالا ہو۔ ایک ہی وجود کے اندر یہ اعضاء خوری اپنی نوعیت کی منفرد آدم خوری تھی۔ جس نے آج تک پوری قوم کے حواس معطّل کر رکھے ہیں۔ اور جانے خون کے دھبّے کتنی برساتوں کے بعد دُھلیں گے؟ دُھلیں گے بھی یا نہیں۔

''باگھ'' میں آدم خوری کا فریضہ اسٹیبلشمنٹ سرانجام دیتی ہے۔ یہ پولیس سٹیٹ میں ایک بے بس لڑکے پر گزرنے والی قیامتوں کا احوال ہے۔ یہ بے بس لڑکا پوری قوم بھی ہے۔ تیسری دُنیا بھی ہے اور اب تو ۹/۱۱ کے بعد اس کو کارپٹ بمباری کے تناظر میں بھی ایک علامت کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ پولیس سٹیٹ میں پولیس کا دستِ کرشمہ ساز جو چاہے کرے۔ قاتل وہ نہیں جو قتل کرے' قاتل وہ ہے جسے پولیس قاتل ثابت کرنا چاہے۔ تھانے دراصل انسان توڑنے پھوڑنے کی فیکٹریاں بن چکے ہیں ان میں بیٹھے ہوئے آدم خور نہ صرف جسمانی تشدّد سے کام لیتے ہیں بلکہ جنسی استحصال، نفسیاتی شخصیت کے انہدام اور اخلاقی بے راہ روی کو بھی فرائضِ منصبی میں شمار کرتے ہیں۔ اُن کی زبان بھی غیر انسانی غراہٹ کی نمائندہ ہے۔ جسم چھلنی ہونا تو ایک طرف، روحیں تک پامال ہو جاتی ہیں۔

''جیسے ہی اسد تھانے کے دفتر میں داخل ہوا، اس نے محسوس کیا کہ ماحول یکسر بدل چکا ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل کی ٹکٹکی' سپاہیوں کے کھڑے ہونے کا بیباک انداز اور تھانیدار کے چہرے کی خشونت، چھوٹتے ہی تھانیدار نے سوال کیا:

''اقبالِ جرم کر رہے ہو؟''

''کیسا اقبالِ جرم؟''

''کہ تو نے اپنی ماں کے ساتھ زنا کیا ہے' اور کیسا۔''

اسد باری باری ہر ایک کے چہرے کو دیکھتا رہا۔

....

''میں نے کیا کیا ہے؟'' اسد نے پوچھا

''اُس بڈھے کو قتل کیا ہے۔''

''نہیں۔''

....

آپ لوگ مجھے زیادہ سے زیادہ پیٹ سکتے ہیں یا گالیاں دے سکتے ہیں۔مگر مجرم قرار نہیں دے سکتے۔'' اسد نے کہا۔ اوہواوہوتو گویا ہم یہی کچھ کر سکتے ہیں؟ انہوں۔'' تھانیدار نے چالا کی سے سر ہلایا'' تجھ سے نازک اندام لڑکے کو مارنے پیٹنے کا کیا فائدہ؟ تیرے تو یہاں چاہنے والے ہی بہت ہوں گے۔ اسد کے ساتھ کھڑا سپاہی ہاتھ بڑھا کر اس کے چوتڑ مسلنے لگا۔ اسد اس کے ہاتھ کی زد سے باہر کھسک کر کھڑا ہو گیا۔ ''میں تورات کو پھر گمشد جا رہا ہوں۔ پیچھے لال خاں تمہارا انچارج ہے۔ سردی لگی تو اسے بُلا لینا۔ تمہارا بستر گرم کر دے گا۔'' سپاہی لال خاں نے اسد کے گال پر ایک سخت سی چٹکی بھری۔ اسد نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ''بُلانے کی کیا ضرورت ہے جی۔'' سپاہی بولا' ہم خود حاضر ہو جائیں گے۔ ایسے ایسے نرم نڈے کوئی روز روز آتے ہیں؟'' ۳

''باگھ'' میں تھانیدار اسد سے اقبالِ جرم کروانے کے لیے اُس سے ایک چاقو کی بابت پوچھتا ہے تو اسد اپنی لاعلمی کا اظہار کرتا ہے۔

> ''میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ یہ میرا نہیں۔'' ایگزامیز کی رپورٹ ہے کہ یہ انسانی خون ہے۔''
>
> ''ہوگا۔'' اسد نے کہا، ''میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ یہ میرے ٹرنک میں تھا۔ پتا نہیں کہاں سے لے آئے ہو؟''
>
> ''تیری ماں کی بچہ دانی سے کھینچ کر لایا ہوں۔ لے
>
> یہ لے ---------------
>
> تھانیدار سپاہیوں کی طرف دیکھ کر بولا، ''تلاشی لو'۔
>
> ایک بار پھر قیدی کی تلاشی سر کے بالوں سے شروع ہوئی کانوں میں روشنی پھینکی گئی، منہ کھولو۔ آگے جھکو بھدّی کرخت انگلیاں اس کے پوشیدہ حصّوں میں گھُستی اور نکلتی رہیں۔'' ۴

باگھ میں انسان شکن معاشرت میں زندگی کرنے کا جتن ایک کارِفضول کی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے عمل سے ایک قدم اٹھانا بھی ناممکن ہے۔ انسان اپنے عمل اور بےعملی' دونوں صورتوں میں مطمئن زندگی گزارنے سے قاصر رہتا ہے کیونہ معاشرہ ایک جبر کے حصار میں ہے۔ باگھ میں بھی ایک ایسا حصار ہے جس کو توڑنا اسد کے بس کی بات نہیں وہ اپنی زندگی کا فیصلہ خود نہیں کر سکتا' وہ اپنی منزل کو پہچانتا تو ہے لیکن اپنی منزل پر ڈیرے نہیں ڈال سکتا۔ کیونکہ جبر''گمشد'' کا گاؤں نہیں بلکہ حقیقی گمشدگی ہے۔ باردگر گمشدگی بلکہ بارہا گمشدگی۔ باگھ کا انسان اسی گمشدگی کی مٹی میں گوندھا گیا ہے۔ عبداللہ حسین کا یہ ناول تو کچھ سال پہلے لکھا گیا

لیکن آج ایجنسیوں کے ہاتھوں اٹھائے گئے (missing person) لوگوں کا مسئلہ زبان زد عام ہے۔ شاید انفرادی گمشدگی جو ریاستی جبر کا نتیجہ ہے کسی دن عالمی استعمار کے ہاتھوں ہماری اجتماعی گمشدگی میں تبدیل ہو جائے یا تقریباً ہو چکی ہو۔ بہر حال اسد کو بالآخر مجبور محض انسان کی علامت کے طور پر ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہاں انسان کے حقِ انتخاب کے مسدود ہونے کی انتہا دکھائی گئی ہے کہ جہاں بے عملی سے وہ شکار بنتا ہے اور عمل سے قاتل' تیسرا کوئی راستہ باقی نہیں ہے۔ ناول کے آخر میں اسد مکمل تھکن کا استعارہ بن چکا ہے۔ سرتا پا شکستگی اور غیر مشروط حتمی پسپائی۔ بالآخر بدن پہ تھکن کے آثار کے باوجود اس کے چہرے پر اطمینان نظر آتا ہے۔ آخری ہار کا اطمینان۔ کھیل ختم ہونے کا اطمینان۔

> ''جب دروازے پر دستک ہوئی تو اسد اٹھ بیٹھا، جیسے وہ پہلے سے ان کا منتظر ہو۔۔۔۔ (یاسمین) جو پاؤں کے پنجوں پہ اپنا جسم سنبھالے گم سم بیٹھی تھی، لپک کر اسد کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔
>
> ''کہاں جا رہے ہو؟''
>
> ''ذوالفقار کے آدمی آئے ہوں گے۔'' اسد نے اطمینان سے کہا مگر وہ کنڈی اتارنے لگا تو یاسمین پھر اس کے سامنے آ گئی۔ ''تھوڑی دیر اور دیکھ لو' اسدی شاید چلے جائیں۔''
>
> ''نہیں جائیں گے۔'' اسد آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔''۵

''شاید چلے جائیں'' میں ایک معصوم بے بس روحِ انسانی کی امیدِ موہوم کی جھلک نظر آتی ہے اور ''نہیں جائیں گے'' میں معلوم ہوتا ہے کہ جواب دینے والا انسان یاس کی تاریکیوں میں ڈوب چکا ہے اور یہاں یہ مختصر جملے جابر او رمجبور کی ازلی جدلیات پر نوحہ کناں نظر آتے ہیں۔ یا منیر نیازی کے الفاظ میں ''عمر میری تھی مگر اس کو بسر اس نے کیا'' والا معاملہ ہے۔

تیسرے راستے کی تلاش، غیر جانبدارانہ زندگی بسر کرنے کا آدرش عبد اللہ حسین کے یہاں بہت واضح ہے اور وہ ہمیشہ اس بات پر سرگراں نظر آتے ہیں کہ ظالم اور مظلوم کی ازلی جدلیات میں ہمیشہ ایک حیثیت کیوں قبول کرنا پڑتی ہے۔ تیسری سمت کہاں ہے؟

> ''راستہ طے کرنے میں ایک بڑی مشکل تھی کون سا راستہ اختیار کیا جائے؟ دو راستے اس کے علم میں تھے۔ ایک راستہ سڑکوں اور دوسرے رستوں کا تھا' جو عام استعمال میں آتا تھا۔ دوسرا راستہ ان کے اپنے آدمیوں کا تھا جو سرحد کے قریب قریب تو بارودی سرنگوں کے باعث بدلتا رہتا تھا' مگر آگے نکل کر سڑکوں کے آس پاس چلتا تھا۔ یہ دونوں راستے اس پہ بند تھے۔ تیسرا راستہ اس کے علم میں نہیں تھا اور یہی نامعلوم راستہ اسے اختیار کرنا تھا، وہ راستہ کونسا تھا؟ اُسے صرف اتنا پتا تھا کہ جہاں تک وہ ان دونوں راستوں سے دُور دُور رہ کر چلتا جائے وہی تیسرا راستہ ہوگا۔''۶

اداس نسلیں میں نعیم کی غول میں گم ہوتی کمر دکھاتے وقت بھی اس کی لاپرواہی کے ذریعے عبد اللہ حسین یہ دکھانا چاہتے تھے کہ وہ مارنے اور مرنے والوں، دونوں سے اپنی الگ شناخت چاہتا ہے۔ نہ بھیڑ نہ بھیڑیا۔ باگھ میں آخری صفحات میں بھی تیرے راستے کی خواہش کلبلاتی نظر آتی ہے۔ جب یاسمین اسد کو یاد دلاتی ہے کہ تم اپنے عمل سے ایک قدم اٹھانا چاہتے تھے ''اب مطمئن ہو گئے ہو؟'' اس کے جواب میں اسد دیر تک اس کے چہرے پر نظریں جمائے رکھنے کے جس سوچ

میں گم وہ اداس نسلیں میں نعیم کے آخری ردِّ عمل کا تسلسل ہے کہ ''میں اسے کیا بتاؤں' اس نے سوچا' کہ بے عملی سے ہم شکار بنتے ہیں اور عمل سے قاتل؟[۷]

دو آدمی تاریکی میں اسد کو گھر سے اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ وردیوں میں تھے یا سادہ لباس میں یہ تو واضح طور پر علم نہیں ہوتا لیکن ناول نگار کا جدید دور میں ایجنسیوں کا انسانی زندگی میں منفی کردار کی طرف صاف اشارہ موجود ہے اور یہاں اس ناول کے اہم ترین جملے بھی موجود ہیں جو ہیمنگوے کی کہانی ''The Killer'' کی یاد دلاتے ہیں جو قاتلوں سے بچنے کی مسلسل کوشش سے اتنا تھک چکا ہے کہ اپنی موت سے بے نیاز ہو کر پسپائی اختیار کر چکا ہے۔ اگرچہ جسم کی سطح پر زندہ ہے لیکن قاتلوں سے مسلسل ہنکاتے ہوئے اسے اندر سے ختم کر چکے ہیں یہی حال کافکا کے ''The Trial'' کے ہیرو جوزف k کا ہے۔ وہ اس قدر مسلسل گھیراؤ سے اکتا چکا ہے کہ آخر میں جب اسے قتل کرنے کے لیے لے جایا جاتا ہے تو وہ تیز تیز موت کی طرف بھاگنا شروع کر دیتا ہے۔ تاکہ نادیدہ حصار بندی کی مسلسل اذیت ختم ہو جائے اب اس تناظر میں اسد کو جب اٹھا کر لے جایا جا رہا ہے تو وہ کسی امید کے سہارے مڑ کر نہیں دیکھتا بلکہ یہ صورتحال ایک انسان کی مکمل شکستگی اور پسپائی کی مظہر ہے۔

> ''دو آدمیوں نے جھپٹ کر اسد کو ہوا میں اٹھا لیا وہ اپنے بازو اسد کی کمر اور ٹانگوں میں ڈالے، اٹھائے اٹھائے اسے ایک خچر کے پاس لے گئے۔ وہاں پر انہوں نے اُسے اوپر اٹھا کر آہستہ سے خچر کی پُشت پر بٹھا دیا اسد کے بدن سے مزاحمت خارج ہو چکی تھی۔ وہ اپنا بوجھ ان کے بازوؤں کی پالکی پہ ڈالے آرام سے خچر کے اوپر جا بیٹھا، کاٹھی پر بیٹھ چکنے کے بعد اس نے نیچے کودنے کی کوشش نہ کی، بلکہ اپنے جسم کو دائیں اور بائیں کھسکا کر زہن کی مضبوطی کو جانچا اور پھر ایک جگہ پر جم کر بیٹھ گیا۔''[۸]

یاسمین کی کُوک ''اسدی'' قاری کے کانوں میں گونجتی رہتی ہے اور اسد 'باگھ' کے آخر تک عجیب کشمکش میں مبتلا ہے۔ یہ ذہنی الجھاوے ہر اس جکڑے ہوئے انسان کی کشمکش کے عکاس ہیں جو جبری کی فطرت اور ظلم کی طاقتوں کی منطق کو بے بس قیدی کی حیثیت میں سمجھنا چاہتا ہے۔

> ''یہ لوگ مجھے کہاں لے کر جا رہے ہیں، اس کا مجھے علم نہیں۔ اگر قید میں ڈالنا تھا تو اس علاقے سے باہر کیوں لے جا رہے ہیں؟ اگر دیس نکالا دینا ہے تو اس طرح قیدی بنا کر لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ عجیب سفر ہے۔''[۹]

''باگھ'' میں موجود انسانی صورتحال کی تمام تر اندوہناکی کے باوجود زندگی کرنے کا جتن نظر آتا رہتا ہے اور اسد جس کے سینے پر تھکاوٹ بیٹھ چکی تھی اور جس کی سانسوں میں اپنے ہی وجود کے خلاف سازش پلتی رہتی تھی۔ وہ بدترین حالات میں بھی زندگی کی گُم ہوتی شکل کو مزید دھندلانے سے بچانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ چاہے یہ کوشش محض خیال کی سطح تک محدود کر دی جائے۔

> ''اس بے دید، بے صوت کھوٹھڑی پر اُسے ایک ایسے دربند مقبرے کا گمان ہوا جو مدّت ہوئی کہ تلاطم میں آ کر زیرِ زمین دفن ہو چکا ہو۔ یہ احساس کہ یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں' کہ اب وہ قیدی ہے اور اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں' اس کے دل کو شل کیے جا رہا تھا۔ کوئی سبیل' کوئی جُل' کوئی چکمہ' کوئی آدمی' اس

نے سوچا' کوئی تو ہوگا۔ کیسے ممکن ہے کہ کوئی راستہ ہی نہ ہو۔ ہر کسی کا کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکلتا ہے وگرنہ تو زندگی ختم ہو جائے۔ تو کیا زندگی ختم ہو رہی تھی؟ اس نے حیرت سے سوچا۔ یہ مان لینا اس کے لیے انتہائی دشوار تھا کہ امید کی رمق بھی نہیں رہی۔ یہ بات اسے بعید از قیاس ہی نہیں، نہایت احمقانہ لگتی کہ وہ ابھی زندہ ہو اور کوئی ایک راستہ بھی نہ رہے؟ میں ابھی زندہ ہوں' اس نے پیٹ میں بُھوک محسوس کر کے سوچا۔''۱۰

اسد ناول کے آخری جملوں میں بھی جب گزری ہوئی زندگی کا تجزیہ کرتا ہے تو اپنے وجود کے اثبات کے لیے کچھ نہ کچھ دلیلیں تلاش کرنے میں کامیاب ہو ہی جاتا ہے۔ اسد دراصل بدترین حالات میں زندگی گزارنے کی کوشش کا انسانی استعارہ ہے۔ وہ اپنے بچپن میں بکرے کی قربانی کے لمحوں کو یاد کرتا ہے اور بکرے کی آنکھوں میں چمک کو بطور علامت اپنی ذات پر منطبق کر کے خود کو مطمئن کرتا ہے۔

''جب اس روز صبح سویرے قصائی نے موتی کو پچھاڑ کر اسے ذبح کیا تو میں ڈر کر پیچھے ہٹنے کی بجائے آگے نکل کر بابا کے پاس جا کھڑا ہوا اور کانپتے ہوئے نرخرے کو اور نالی میں بہتے ہوئے خون کو دیکھنے لگا۔ وہ شاید پہلا موقع تھا جب میں اپنے آپ میں سے نکل کر الگ کھڑا ہو گیا تھا اور غور سے ان آنکھوں کو دیکھ رہا تھا جو میرے دیکھتے دیکھتے بٹنے بن گئی تھیں۔ انکی چمک برابر قائم رہی تھی اور ان کی شکل میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی، مگر صاف دکھائی دیتا تھا کہ نظر کہیں ٹھہر گئی ہے۔۔۔۔ یاسمین نے کہا تھا اسدی تم نے بڑے دکھ اٹھائے ہیں' مگر یہ تو کوئی بات نہیں۔ میں اپنے سانس کے عارضے کی خاطر ادھر ادھر ہوتا رہا ہوں مگر ایسے ایسے عارضے کس کو نہیں ہوتے صرف اتنی بات ہے کہ اس بجلی کی چمک کو میں قائم رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اور اس وقت تک کرتا رہوں گا جب تک میرے دل میں زور ہے۔''۱۱

آدم کی آدم خوری کی ایک قسم مذہب کی آڑ میں سامنے آتی ہے عبداللہ حسین ''قید'' میں دکھاتے ہیں کہ خدا کے نام پہ خدائی پر کیا گزرتی ہے۔ تنگ نظر، کم علم اور کم ظرف مولوی ڈریکولا بن کر ہمارے معاشرے کی انسانی سطح کو ختم کرنے پر تُلا بیٹھا ہے اس عفریت کے ایک اشارے پر ہوسکتا ہے کہ ایک نوزائیدہ کے سر کی ملائم ہڈی جو ایک مٹھی میں دبا کر ٹکڑے ٹکڑے کی جاسکتی ہے' بھاری پتھروں کی مار میں ہو۔

''بتا احمد شاہ' بتا' تو اس بہیمانہ جرم کا مرتکب کیوں ہوا؟''۔۔۔۔۔۔

''مسجد کی حرمت کے بارے میں خدا کے سخت احکام ہیں۔''

''حرمت کے چوکیدار مولوی'' رضیہ سلطانہ چلاّ کر بولی۔ ''چار گھنٹے کی معصوم جان خدا کے گھر کی بے حرمتی کرے گی؟ خدا کا گھر اتنا کچّا ہے؟ سن' ہم غریب لوگ ہیں مگر میں عالموں کے گھرانے کی اولاد ہوں۔ سُن تیرا خدا کیا کہتا ہے۔ سورہ بقر کو یاد کر۔ یُصّو رکم فی الارحام۔ میں ماؤں کے رحموں میں (بچے کی) تصویر بناتا ہوں۔ احمد شاہ' تم اللہ کی بنائی ہوئی تصویر کو پتھروں سے پاش پاش کرتے ہو اور پاکدامنی کے دعویدار بنتے ہو؟ یہ حق تجھے کس نے دیا ہے؟ تم دوسروں کے گناہوں کا حساب چکاتے ہو؟ پھر سورۃ بقر کو

یاد کرو۔ تِلکَ اُمّۃ قد خَلَتْ لَھا ما کَسَبَت وَلَکم ما کَسَبْتم وَلاَ تُسئَلُون عَمّا کانُو یعَلمُون۔ وہ ایک امت تھی جو گزر چکی' اسے ملے گا جو اس نے کمایا اور تمھیں ملے گا جو تم نے کمایا، اور تم سے نہ پوچھا جائے گا جو وہ کیا کرتے تھے۔ احمد شاہ تم کسی شے کے ٹھیکیدار نہیں ہو۔ بے حرمتی کی بات کرتے ہو؟ رسول کی حدیث یاد کرو۔ فرماتے ہیں بچے کو چپت مت مرؤ اور فرماتے ہیں غلافِ کعبہ کی بے حرمتی سے زیادہ مجھے انسان کی بے حرمتی کا دُکھ ہوگا۔''۱۲

اداس نسلیں، باگھ، نادار لوگ، ناولٹوں، افسانوں اور تازہ افسانوی مجموعے ''فریب'' میں مجموعی طور پر دیکھیں تو عبداللہ حسین کے یہاں ایک ایسے انسان کی تلاش نظر آتی ہے جو تاریخ کے جبر، جابر قوّتوں کے استحصال اور ظلم کے طوق سے آزاد ہو۔ انسان دوستی کا ایسا خواب جس میں انسان اس طور پر آزاد ہو کہ نہ تو قابیل زادوں میں شامل ہوا اور نہ ہابیل کی تقدیر کا جُھومر اپنے ماتھے پر سجائے ہوئے ہو۔ وہ ایک ایسے انسان کی جستجو میں نظر آتے ہی جو جابر اور مجبور کی ازلی جدلیات سے باہر کی دُنیا میں زندگی بسر کر سکے۔ لیکن تاحال ان کو اس انسان کا وجود نظر نہیں آتا اور نہ ہی اس کی عملی پیشکش ان کے یہاں موجود ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ عبداللہ حسین، نادار لوگ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص: ۴۳۴

۲۔ ایضاً، ص: ۲۶

۳۔ عبداللہ حسین، باگھ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص: ۱۲۵۔ ۱۲۶۔ ۱۲۷

۴۔ ایضاً، ص: ۱۴۶۔ ۱۴۷

۵۔ ایضاً، ص: ۳۴۴

۶۔ ایضاً، ص: ۳۲۰

۷۔ ایضاً، ص: ۳۴۳

۸۔ ایضاً، ص: ۳۴۵

۹۔ ایضاً، ص: ۳۶۰

۱۰۔ ایضاً، ص: ۳۶۰

۱۱۔ ایضاً، ص: ۳۵۹

۱۲۔ عبداللہ حسین، قید، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص: ۹۶